R.No. 2180/57 · Regd. No. L.88.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ٹیلی فون — ۲۹
قیمت چھ روپے سالانہ
فی پرچہ دو آنے

تاریخ اشاعت

جلد ۲۳ - شمارہ ۲۰ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | ۲۲ مئی سنہ ۱۹۶۲ء

اداریہ

چھٹی میں کرنے کے کام

اب اسکولوں میں جن چھٹی ہو گئی ہے۔ یہی وقت ہے کہ اگلے تعلیمی سال کا پروگرام بنایا جائے اور اردو کی تعلیم کے انتظام کے لئے خصوصی کوشش کی جائے۔ اتر پردیش میں وزیر تعلیم کے اعلان کے مطابق اگر پانچ طلبہ بھی اردو کی تعلیم کی خواہش کریں گے تو ان کے لئے مناسب انتظام کیا جائے گا۔ دہلی میں نہ معلوم کیوں بارہ کی قید رکھی گئی ہے۔ پنجاب کی حکومت بھی جہاں جہاں ضرورت ہو اردو کی تعلیم کا انتظام کرنے پر آمادہ ہے۔ بہار میں تو آج بھی یہ سہولت موجود ہے گو بعض جگہ دفتری نظام کی وجہ سے دقت ہے۔ مدھیہ پردیش اور راجستھان میں بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں مطالبہ اور خواہش ہے مگر انتظام نہیں ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ ان علاقوں کی ریاستی اور مقامی شاخیں اس وقت سب سے زیادہ توجہ اسکولوں میں اردو کی تعلیم پر دیں۔ جگہ جگہ اردو ہفتے کرکے انجمن کی ممبر سازی کرنی چاہئے۔ جگہ جگہ طلبہ کے والدین کی طرف سے اردو میں ابتدائی تعلیم اور مڈل اسکولوں میں تیسری زبان کے طور پر اردو پڑھانے کے لئے درخواستیں جمع کرنی چاہئیں۔ ہو سکے تو مقامی شاخوں کو خود بھی اردو کا کوئی اسکول چلانا چاہیئے۔ موسم کی تلخیاں اس کام میں سدراہ نہیں ہونی چاہئیں۔ حکومت سے ہمارا مطالبہ برابر ہوتا رہے لیکن ہمیں خود بھی ٹھوس کام کرکے اپنی زندگی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ ایسا نہیں ہے کہ اکثریت یا حکومت بالکل پتھر ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے فرض سے غافل ہیں اور جمہوریت کی روح، اخلاق کے تقاضے، انصاف کی ضروریات سے بے پروا ہیں، ان کو برابر توجہ دلائی جائے تو ان کا سویا ہوا ضمیر جاگ سکتا ہے۔ مگر ہمیں بھی مایوسی اور بددلی کو ترک کرکے عزم و عمل کا ثبوت دینا ہے۔ جلسوں اور کانفرنسوں، شاندار قرار دادوں اور رعب دار مجالس ہائے عمل سے کچھ نہیں ہوتا، اصل چیز اردو دوستوں کا عمل ہے۔ پیہم اور مسلسل عمل اور جدوجہد، اس کام میں تمام محبان وطن، قومی کارکنوں اور ہندی اور دوسری زبانوں کے انصاف پسند حامیوں کی مدد بھی حاصل کرنی چاہئے۔ بات سیدھی سادی ہے۔ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں بچے اور بچیاں اردو پڑھیں اور ہزاروں کی تعداد میں اردو کے اسکول ہوں۔ اردو کے تحفظ کی سب سے اچھی ضمانت یہی ہے۔ اردو دوستوں کو اپنے خلوص اپنی صلاحیت اور اپنی زندگی کا عملی ثبوت دینا ہے

اس اشاعت میں

سیر بین

ایک امتحان کے پرچے میں جگر صاحب کے متعلق یہ سوال دیا گیا تھا :-
"جگر کے یہاں فیضانِ محبت ہی نہیں عرفانِ محبت بھی ہے" واضح کیجیے۔

ایک امیدوار نے سوال سے بڑا دلچسپ کام لیا اور اپنے جواب میں لکھا: "جگر صرف فیضانِ محبت ہی نہیں عرفانِ محبت بھی سے تھے"۔ دوسرے نے ایک اور انکشاف کیا؛ انہوں نے شیرازن ایک "خواتین" سے عشق کیا۔ یہ امیدوار رشید احمد صدیقی پر بھی فوقیت لے گیا۔ انہوں نے اردو کو دو لفظ دیے تھے، ایک "الدین" دوسرا اولڈ بوائز۔ مثلاً یونیورسٹی کھلتے ہی ایک "الدین" قسم کے بزرگ وارد ہوئے۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسے کے موقع پر ایک پرانے گنہ گار ہر ایک سے پوچھتے تھے۔ آپ اولڈ بوائز ہیں؟ ہم بھی اولڈ بوائز ہیں۔ اب اس امیدوار کے طفیل ہم آپ بھی لکھ سکتے ہیں۔ آج ایک خواتین سے ملاقات ہوئی۔ بڑی دلچسپ باتیں رہیں۔

راقم الحروف اپنی دو کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہے۔ اگر تفریحاً بھی کوئی مچھر کان کے پاس آکر اپنا نغمہ الاپنے لگے تو نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی طالب علم اپنے مضمون میں "اشعاروں"، "افکاروں"، "الفاظوں" لکھے تو جی چاہتا ہے کہ نہ صرف اُسے امتحان میں فیل کر دیا جائے بلکہ اُس کی پچھلی ڈگریاں بھی چھین لی جائیں۔ مگر زمانہ یہ آگیا ہے کہ "الفاظوں"، "اشعاروں" سے کہیں نجات نہیں ملتی۔ طلبہ نہ صرف ٹیوٹوریل میں ان الفاظ کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں بلکہ ٹوکنے کے باوجود امتحان میں بھی باز نہیں آتے۔ پھر مہر مہدی کو میر ہندی اور مہدی افادی کو مہندی افادی لکھنے پر بھی اصرار کرتے ہیں۔ مچھروں کے نغمے کا علاج تو یہ ہے کہ بھلا آدمی جاڑے، گرمی، برسات مچھردانی لگائے، مگر ان نئے ادیبوں کے تیروں کا کیا علاج ہے؟

ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم اُردو کے کچھ ایسے قائل نہ تھے کچھ لوگوں نے اُن سے کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم نہایت کامیابی سے دی جا رہی ہے۔ آپ خود جا کر دیکھ لیجیے۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد حیدر آباد گئے اور وہاں سے واپس آئے تو ارشاد فرمایا: "میں وہاں ہو آیا۔ محض پروپیگنڈا ہے۔ وہاں ہے کیا۔ دو متنفس یہاں بیٹھے ہیں، دو متنفس وہاں بیٹھے ہیں۔" اس منطق کو چھوڑیے کہ طلبہ کی تعداد اور تعلیم کے معیار میں کیا تعلق ہے۔ صرف یہ دیکھیے کہ ڈاکٹر صاحب نے متنفس جیسے ثقیل لفظ کو کس طرح سبک رواں اور سہل بنا دیا۔ انہیں کی تقلید میں ایک صاحب مخالفت کے بجائے "خلافت" کہتے ہیں اور دوسرے دیدہ ور کو دیدہ در۔ مطلب سمجھنے میں کسی کو دقت نہیں ہوتی۔ نہ طرفدار کو نہ سخن فہم کو۔

انجمن تعمیر اُردو امروہہ

انجمن تعمیر اُردو امروہہ کی کوششوں سے گورنمنٹ گرلس انٹر کالج امروہہ میں انٹر درجات میں اُردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا گیا ہے اور اگلے سیشن سے اُردو کے کلاس شروع ہو جائیں گے۔

اس کوشش میں انجمن کے سرگرم کارکن سید شبیر احمد صاحب جوائنٹ سکریٹری کا بڑا دخل ہے۔ موصوف نے کافی دوڑ دھوپ کے بعد اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام تک پہنچایا۔ رئیس بھی صاحب اور مظفر حسین صاحب رضوی کی کوششوں کا بھی اس میں دخل ہے اور محکمہ تعلیم کے ذمہ داران نے بھی اس سلسلے میں کافی مدد کی۔

تاریخی مسودوں کی کھوج

کشمیر کے محکمہ ریکارڈ نے قدیم زمانہ کے تاریخی مسودوں تصاویر اور دیگر کتابوں کا پتہ لگانے کے لئے جموں اور لداخ میں سروے کا کام مکمل کر لیا ہے۔ جموں میں اس غرض کے لئے محکمہ نے پہلے ہی ایک کمیٹی قائم کر دی تھی اس کمیٹی کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ گذشتہ دو ماہ کے دوران جن میں ڈھائی سو سے زیادہ قدیم زمانے کی کتابیں اور تصویریں جمع کی جا چکی ہیں۔ (روشنی سری نگر)

ادیبوں کو انعامات

تحریک امداد باہمی کے مختلف پہلوؤں پر مختصر ڈرامے، افسانے، مضامین اور نظمیں تخلیق کرنے پر ۵۲ آدمیوں کو مجموعی طور پر دو ہزار روپے کے نقد انعامات دیے گئے ہیں۔

اس مقابلے میں جو اُتر پردیش کی امداد باہمی کی انجمنوں کے رجسٹرار کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا ایک سو ایک آدمیوں نے حصہ لیا۔ ان میں ۷۲ نے ہندی، ۱۱ نے انگریزی اور ۱۸ نے اُردو میں تخلیقات پیش کیں۔ (قومی آواز)

فراق گورکھپوری   ترجمہ عبد الحئی

میری ہندی دشمنی

اُردو کی حمایت میں چند سال قبل میرا ایک مضمون جس کا عنوان "URDU WITHOUT PREJUDICE" تھا، ہندوستان ٹائمز میں چھپا تھا۔ اس مضمون پر چاروں طرف سے بڑی لے دے ہوئی۔ تقریباً چار سال کی طویل خاموشی کے بعد میں نے ایک بار پھر دانستہ یہ ستم کیا کہ اسی اخبار میں "ہندی علاقے میں ثقافتی بحران" کے موضوع پر دو اور مقالے شایع کر دئے۔ اس پر بھی میری خوب خبر لی گئی۔

نیتاؤں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں اب تک "استاد سیاست دانوں" کو نہایت خطرناک سمجھا جاتا رہا ہے کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ طلبہ میں سر پھرے خیالات پیدا کرنے والے بھی سیاست داں اساتذہ ہیں۔ یہ اُستاد نیتا ہی کیا کم تھے کہ حال ہی میں سیاست دانوں کی برادری میں "لسانی نیتاؤں" کا اضافہ ہو گیا۔ ان کی ساری سیاست "زبان" کے گرد گھومتی ہے۔ ہندی کو نقصان پہنچانے میں دورِ جدید کے ادق نگار ہندی ادیبوں نے ہی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے، ان کی عنایتوں سے ہندی ٹھیٹ گنوارو زبان بن کر رہ گئی ہے۔ رہی سہی کسر لسانی نیتاؤں نے پوری کر دی ہے۔ جن کا نعرہ ہے "ٹھیک یا غلط جیسی بھی ہو ہندی ہو"۔

میں نے اپنے مذکورہ مقالوں میں اس بات پر زور دیا تھا کہ کھڑی بولی کو بطور زبان استعمال کرنے کے لئے ستھرا ذوق بہت ضروری ہے۔ میں کوئی لسانی نیتا نہیں ہوں۔ میری زندگی کے پچاس سال زبان و ادب کے مطالعہ میں گذرے ہیں اور جہاں تک ہندی زبان کا تعلق ہے میں ہندی کے قدیم مسلمان اور ہندو اساتذہ مثلاً کبیر، سورداس، تلسی داس، میرا بائی، رحیم اور رس خاں کی ہندی کو نہایت پسندیدگی اور احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن موجودہ دور کے ہندی ادیبوں اور شاعروں کی ہندی انشائے عالیہ کے ان اصولوں کا خون کر دیتی ہے جو میں نے اب تک سیکھے ہیں اور جن کے مطالعے نے میرے اندر اچھے ادب سے متاثر ہونے کا ایک لطیف احساس پیدا کر دیا ہے۔ جب میں دورِ جدید کے ہندی ادیبوں اور شاعروں مثلاً پنت، نرالا، پرشاد، مہادیوی اور میتھلی شرن گپت کی تصانیف پڑھتا ہوں تو میرے اس احساس پر چوٹ سی لگتی ہے۔ میرا دل ان کی ہندی کو پسند کرنے پر مائل نہیں ہوتا، اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟

کھڑی بولی کو میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، چکبستؔ، اقبالؔ اور اُردو کے دوسرے بے شمار اساتذۂ فن نے نکھارا اور سنوارا لیکن ادبی جنون، فطری گنوارو پن اور غلط پروپیگنڈے کو کیا کہا جائے جس نے بدقسمت عوام کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ اُردو شعرا کی مقبولیت کی وجہ ان کے کلام میں غیر ہندی عناصر، اور عربی فارسی الفاظ و تراکیب کی بھرمار ہے، اور لوگ یہ بھول گئے کہ اُردو ادب کا سارا وہ حصہ جو تاثیر و مقبولیت میں اپنی مثال آپ ہے، ہندی الفاظ و محاورات ہی سے مرکب ہے۔ اُردو زبان اور اُس کے ہمہ گیر ادب میں ہندی کے جتنے الفاظ، محاورات اور رنگا رنگ کی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں ہمارے آج کل کے ہندی کے کویوں اور لیکھکوں نے اُن کا عشر عشیر بھی استعمال نہیں کیا ہے۔

میں ہندی کے حامیوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ میرے دعوے کو غلط ثابت کر دکھائیں اور مجھے بتائیں کہ موجودہ نام نہاد "کھڑی بولی ہندی" میں کتنے خالص ہندی الفاظ، فقرے، محاورے اور ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔

آج تو یہ حال ہے کہ ہندی میں چن چن کر سنسکرت الفاظ ٹھونسے جا رہے ہیں ستم یہ ہے کہ ہندی سے ہندی الفاظ کو خارج کیا جا رہا ہے، اور جو ہندی الفاظ رہ گئے ہیں اُنھیں بس "اچھوتوں" کی طرح برداشت کیا جا رہا ہے۔ ہندی خود ہندی سے خائف نظر آتی ہے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے کیا خوب فرمایا تھا کہ آج کی ہندی "تیلی" ہندی ہے۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ ہندی کے پانی میں سنسکرت الفاظ کا تیل حل نہیں ہو سکتا۔ پنڈت بال کشن بھٹ نے بھی نہایت بے خوفی سے یہ اعلان کیا تھا کہ ہزاروں عربی اور فارسی ترکیبیں ہندی کے ساتھ پوری طرح مدغم ہو جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن سنسکرت کے الفاظ میں یہ صلاحیت مفقود ہے۔

جب آپ پنڈت مالویہ اور پنڈت بھٹ کو "ہندی دشمن" نہیں کہہ سکتے تو آخر میرے اوپر یہ عتاب کیوں ہے، مجھے ہندی دشمن کیوں قرار دیا جاتا ہے۔

جدید ہندی کا دعویٰ ہے کہ میں ہندی علاقے کی راج بھاشا ہوں، اُردو کا جواب ہے کہ میں ہندی علاقے کی جنتا ہوں۔ ہندی علاقے کی ساری آبادی کی زبان ہندی (نقلی سنسکرت) اور دو تین ہزار عربی فارسی الفاظ سے مرکب ہے۔

ہندی کی برج بھاشائی شکل تو بجا طور پر یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ برج بھاشا کے ہزاروں مصرعے کروڑوں لوگوں کے کانوں میں آج بھی رس گھول لیتے ہیں۔ یہی دعویٰ اودھی، بھوجپوری، میواڑی، پنجابی اور اُردو زبانیں بھی کرسکتی ہیں۔ لیکن کیا میتھلی شرن گپت، پنت، نرالا، پرشاد یا جدید دور کی نام نہاد "کھڑی بولی ہندی" کا کوی اور شاعر یہ دعویٰ کرسکتا ہے؟

بھارتندو ہریش چندر نے ایک بار جدید ہندی میں نظم کہنے کی کوشش کی۔ جب وہ نظم مکمل کرچکے تو اُس کو دیکھ کر انھوں نے بے دریغ یہ کہہ دیا کہ کھڑی بولی ہندی میں شعر کی زبان بننے کی قطعاً صلاحیت نہیں۔

ہندی کی جن اچھائیوں کو لے کر اُس کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے وہ حقیقتاً اُس میں موجود نہیں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی ایک ممتاز ماہر لسانیات ہیں انھوں نے اپنی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ سادہ اور واقعتاً کارآمد ہندی کے پرچار میں گذارا ہے۔ الہ آباد یونی ورسٹی میں اپنی ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ ناگری رسم خط ایک بہت ہی بھدا اور ناکارہ خط ہے اور یہ کہ اگر ہندی کو رومن رسم خط میں سکھایا اور پڑھایا جائے تو یہ زیادہ آسانی سے اور کم وقت میں سیکھی جاسکتی ہے۔ انھوں نے اپنے اس دعوے کے جواز میں اعداد و شمار بھی پیش کیے۔ خود سبھاش چندر بوس نے کانگریس کے اجلاس میں اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہندی کو عام فہم بنایا جائے اور اس کے لیے رومن رسم خط اختیار کیا جائے۔ ناگری رسم خط میں اُتنی ہی عبارت لکھنے میں دوگنی محنت اور وقت صرف ہوتا ہے جتنی کہ انگریزی میں اس کے آدھے وقت میں لکھی جاسکتی ہے، الہ آباد یونی ورسٹی میں میرا اپنا تجربہ ہے کہ ایک مقررہ وقت میں انگریزی رسم خط میں دو ہزار الفاظ کے نوٹس لکھنا طالب علموں کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن ہندی میں اس کے آدھے الفاظ لکھنے کے بعد ہی طالب علموں کی انگلیاں، کلائیاں اور دماغ بُری طرح تھک جاتے تھے۔ شاید اسی لیے آئین بنانے والوں نے ناگری ہندسوں کو کل ہند استعمال کے لیے ناقص قرار دے دیا تھا اور باوجود شدید مخالفت کے انگریزی ہندسوں کو اختیار کیا۔

کیا یہ ایمانداری کی بات ہے کہ کھڑی بولی کے ارتقا کی تاریخ بتاتے وقت ہم اپنے بچوں کو یہ بات نہ بتائیں کہ للولال اور ان کے تابعین اور بھارتندو ہریش چندر کی پیدائش بلکہ ہندی تحریک اور ہندی نیتاؤں کے معرض وجود میں آنے سے بہت پہلے ہی کھڑی بولی میں ایک زبردست ادب جنم لے چکا تھا۔ اور یہ ادب وہی اُردو ادب ہے جو دو سو سال سے زیادہ سے پھل پھول رہا ہے۔ کیا اس حقیقت سے چشم پوشی کرنا تعلیمی نقطۂ نظر سے مُہلک نہیں ہے؟

تعلیمی نقطۂ نظر سے ہر قسم کے احساس خوف سے زیادہ تاریخی حقائق سے خوف کا احساس اور چشم پوشی انتہائی مضرت رساں چیز ہے اور میرے خیال میں ہندی کے تمام دیوانے اسی احساس خوف کا شکار ہیں۔ اپنے بچوں کو ریاستی زبان کی حیثیت سے کھڑی بولی کی تعلیم دے کر ہم نے ایک بہت بڑا جُرم کیا ہے اور اپنے کروڑوں بچوں کو کھڑی بولی کے اُس حسن اور تاثیر سے بیگانہ رکھا ہے جو میر، غالب، نظیر اکبرآبادی اور اردو نظم و نثر کے بے شمار اساتذہ کی استعمال کی ہوئی کھڑی بولی میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہندی کھڑی بولی کے ادیب اُردو کھڑی بولی کے ادیبوں کی خاکِ پا کو بھی نہیں پاسکتے۔ ہم اپنے بچوں کو کھڑی بولی کی بہترین شکل (اردو) اور اس کے ارتقا کی تاریخ سے ناواقف رکھ کر علم کی بجائے جہالت دے رہے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو شیکسپیر کے اس قول کے مطابق کہ اپنی چیز پھر بھی اپنی ہے، کھڑی بولی ہندی کی انتہائی فرسودہ اور بھدے طرز پر لکھی ہوئی چیزیں پڑھا رہے ہیں اور اسی میں خوش ہیں۔

کیا ہم ہندوستانی تاریخ کی کسی ایسی کتاب کو مکمل اور مستند تاریخی کتاب کہہ سکتے ہیں جس میں مسلم اور برطانوی ادوار حکومت کے بارے میں کچھ نہ بتایا گیا ہو؟

مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہندستان کے یہ عظیم شہنشاہ اور مدبّر، فلسفی اور صوفی، فنکار اور ادیب ہندوستانی تاریخ کے اتنے ہی اہم عناصر ہیں جتنے کہ بڑے سے بڑے ہندو اور بدھ بادشاہ۔

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اُردو کے صحیح اور بھرپور مطالعے کے بغیر کھڑی بولی کا مناسب علم نہیں ہوسکتا۔

آخر میں اتمام حجت کے طور پر چند باتیں عرض کرکے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ (باقی صفحہ ۸ پر)

سلام بن رزاق چوہدری

مرے دوستو!

مرے دوستو! ساتھیو! ہمصفیرو!
ابھی اپنے ہاتھوں سے تیشہ نہ رکھو
ابھی راہ میں سینکڑوں بیستوں ہیں
ابھی تو بہت دور ہے اپنی منزل
تمہارے عزائم کے تیشوں نے کتنے ہی کوہ گراں
سرنگوں کر دیئے ہیں
تمہارے پسینے کے قطروں سے
لاکھوں کروڑوں گلستاں نمو پا چکے ہیں
تمہاری جبیں کی پُر اسرار تابش
چراغ سر طور سے بھی فزوں تر
تمہارے لہو کی ہر اک بوند یارو
بصد رشک خورشید و مہتاب و انجم
یہ ظلم و تشدد کے مغرور پیکر
تمہاری ہی ٹھوکر سے ٹوٹیں گے اک دن
یہ تاریکیوں کی گراں بار میت
تمہارے ہی ہاتھوں سے مدفون ہوگی
تمہاری جبینوں پہ لکھا ہوا ہے
کہ سلطان ہو تم زمان و مکاں کے
مرے دوستو! ساتھیو! ہمصفیرو!
ابھی اپنے ہاتھوں سے تیشہ نہ رکھو

شہاب شمسی

دردِ درماں

دامنِ ماضی سے پروائی خیالِ یار کی
نشۂ تشنہ لبی میں جھومتی گاتی اُٹھی
حجلۂ قلبِ حزیں کے در پہ دستک دے گئی
آہ شہرِ دل سے گذری شور و شر کرتی ہوئی
ایک خوابیدہ شکستہ آرزو کے قلب کو
ناوکِ احساسِ ناکامی سے زخمی کر گئی
غم کی بدلی تیرتی اُٹھی دلِ برباد سے
اس اُفق سے اُس اُفق تک روح پر یوں چھا گئی
دیکھتے ہی دیکھتے اک بارشِ کیف و نشاط
کرب کے زہراب میں ڈوبی ہوئی برسا گئی
ایک محرومِ تصور کو مگر بہلا گئی
اک مریضِ غم کو لیکن آہ یہ تڑپا گئی

نصابی کتابوں کی لائبریریاں

غریب مستحق طلبہ کو معیاری نصابی کتابیں طویل عرصے کے لئے مستعار دینے کے لئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے نصابی کتابوں کی لائبریریاں قائم کرنے کے لئے منتخبہ کالجوں کو مالی امداد دینے کی ایک اسکیم مرتب کی ہے۔

اس اسکیم کے مطابق کمیشن رواں منصوبہ کی مدت کے دوران صدفی صد کی بنیاد پر انڈر گریجویٹ کالجوں کو دس ہزار روپیہ اور پوسٹ گریجویٹ کالجوں کو پندرہ ہزار روپیہ کی گرانٹ دے گا۔ اس رقم سے یہ کالج ضروری نصابی کتابوں کے کئی کئی نسخے حاصل کر سکیں گے۔

آئندہ تعلیمی سال شروع ہونے تک اس اسکیم پر عملدرآمد کے لئے اقدامات شروع کئے جائیں گے۔ (قومی آواز لکھنؤ)

غالب کی نایاب تصویر

معلوم ہوا ہے کہ غالب اکاڈمی نے غالب کی ایک نایاب عکسی تصویر حاصل کی ہے۔ یہ عکسی تصویر مرزا کی وفات سے چھ مہینے پہلے ۱۸۶۹ء میں اُتاری گئی تھی۔ ان دنوں مرزا بیمار تھے اور ان کے شاگرد تصویر اُتارنے کے لئے اُن کو کرسی پر بٹھا کر باہر لائے تھے۔ یہ تصویر سابق پاکستانی ہائی کمشنر مسٹر سعید قریشی سے حاصل کی گئی ہے۔ یہ تصویر ایک انگریز فوٹو گرافر نے اُتاری تھی جس نے شملہ میں اپنا پہلا اسٹوڈیو کھولا تھا۔ (آبشار کلکتہ)

نوبل پرائز کی طرز پر امریکی انعام

نیویارک۔ پچھلے دنوں یہاں "انسانیت" کے لئے نوبل پرائز کے انداز پر تیس ہزار ڈالر کے ایک امریکی انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ انعام اپنی نوعیت کا پہلا انعام ہے جو انسانیت کے نام پر دیا جائے گا۔ اس انعام کا نام "ریمپن ایوارڈ" ہے۔ ریمپن انسٹی ٹیوٹ کے چیرمین ڈاکٹر رابرٹ انڈرسن نے اعلان کیا ہے کہ یہ انعام آئندہ موسم بہار میں تقسیم کیا جائے گا۔ (انگلش ڈائجسٹ)

ٹیگور کا مکان

حکومت پاکستان نے ٹیگور کا مکان واقع سلیدا کو ایک میوزیم میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس میوزیم میں ٹیگور کی تصانیف کے ساتھ ساتھ بینافی کی کھدائی کے نتیجے میں نکلا ہوا سامان بھی رکھا جائے گا۔ (افکار کراچی)

قاضی مختار احمد آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو اُترپردیش

اُردو کے لئے جدوجہد کا پہلا مرحلہ

اُردو زبان کے حقوق کی بقا اور تحفظ نیز اس کو اُترپردیش کی علاقائی زبان منوانے کے سلسلے میں محبان اُردو نے جو جدوجہد کی ہے اس کے نتیجہ میں ہنوز ہم نے پچیس فی صدی سے زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد جن لوگوں نے اُردو کو دیش نکالا دینے کا عزم کر لیا تھا۔ آج انھیں ایک حد تک اپنی رائے میں تبدیلی کرنی پڑتی۔ اس سولہ سالہ دور میں انجمن ترقی اُردو کی کوششوں سے صرف اس قدر ہوا کہ آج اُردو کو چھ مغربی اضلاع کے منطقہ میں ایک ثانوی زبان کی حیثیت ملی۔ باقی پردیش کے اضلاع میں اُردو زبان کی تعلیم کے لئے مشروط رعایتیں حاصل ہو سکیں، اور اُردو تعلیمی نصاب بھی شایع کیا جانے لگا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ جو کچھ حکومت کی جانب سے رعایتیں ملی ہیں ان پر کچھ عمل بھی ہو رہا ہے؟ اگر نہیں ہو رہا ہے تو کیوں۔ ہمیں ماحول کے تحت اس بات پر بھی غور کرنا پڑے گا۔

جہاں ہم یہ سوچتے ہیں کہ اس معاملہ کی تمام تر ذمہ داری حکومت، عمال حکومت، ذمہ داران سررشتۂ تعلیم، ذمہ داران بورڈ و بلدیاتی، متعصب نوکرشاہی اور اُردو دشمن عناصر پر ہے وہاں ہمیں یہ بھی جائزہ لینا پڑے گا کہ ہماری اس کوشش میں کس وقت اور کس مقام پر غلطیاں ہوئی ہیں اور کونسی کمزوری رہ گئی ہے کہ جس کی وجہ سے ہم اپنے مقصد میں ابھی کامیاب نہ ہو سکے۔

بحرانی دور

۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کے لئے اچانک بحرانی دور آیا محبانِ اُردو بے چین ہو گئے۔ کچھ ذہنوں میں اس کے لئے جدوجہد کا خیال پیدا ہوا۔ کچھ ذہن احساس کمتری میں مبتلا ہو کر مایوس ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے یہ سوچ کر کہ اُردو اور ہندی کا مقابلہ ہے۔ "ہندی۔ ہندو۔ ہندوستان" کا نعرہ لگا کر اُردو کو ملک بدر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سیاسی جماعتوں نے اس موقع پر یہ سوچ کر کہ اکثریت اُردو کے خلاف ہے اور اسی کو ساتھ لے کر الیکشن میں وہ کامیاب ہو سکیں گے۔ ان کا ساتھ دیا۔ غرضکہ ملک میں ہماری زبان کے خلاف ایک بہت بڑا محاذ بن گیا۔

سراسیمگی

مقابل کو طاقتور دیکھ کر ہمارے محاذ میں سراسیمگی پیدا ہو گئی اور بجائے اس کے کہ متحد ہو کر مشورہ کے بعد ایک محاذ بنا کر مخالفین کے مورچے کو توڑا جاتا اور رائے عامہ کو ہموار کیا جاتا۔ محبان اُردو پریشانی کے عالم میں کئی محاذ بنا کر اپنے اپنے طور پر اس لڑائی کو لڑنے کے لئے میدان میں اُتر آئے۔ کچھ لوگوں نے اقلیت کی زبان کہہ کر عوام کو اکٹھا کرنا چاہا۔ کچھ دینی تعلیمی اداروں نے اس کو مذہبی زبان بنا کر ایک فرقہ کے لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔

اس موقع پر انجمن ترقی اُردو اُترپردیش نے دستخطی مہم چلا کر اور سب فرقوں کے لوگوں کے دستخط حاصل کر کے (جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُردو ملک کے بہت سے فرقوں کی زبان ہے) صدر جمہوریہ کی خدمت میں اُردو کو اُترپردیش کی علاقائی زبان مان لی جانے کی درخواست پیش کی۔ اس عرصے میں ہندی کو ملک کی سرکاری زبان مان لیا گیا اور دستور ہند نے اُردو کو ملک کی چودہ علاقائی زبانوں میں سے ایک زبان تسلیم کیا۔ اس طور پر ہندی اور اُردو کا مفروضہ مقابلہ تو ختم ہوا اب صرف یہ سوال رہ گیا کہ جن ریاستوں میں اُردو زبان کے بولنے والے کثرت سے موجود ہیں وہاں اُردو کو علاقائی زبان مان لیا جائے۔

الیکشن اسٹنٹ

وقت کے ساتھ ساتھ اُردو دوستوں کے ذہن نے بھی کروٹ لی اور سب ہی اس بات پر متفق ہو گئے کہ جو جمہوری سیکولر پروگرام انجمن ترقی اُردو اُترپردیش لے کر چلی ہے وہ صحیح ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ جملہ اداروں کا مختلف طریق کار ہماری اس جدوجہد میں کافی رکاوٹ کا باعث بنا ہے جس کی وجہ سے ابھی تک ہمیں پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی افسوس تو یہ ہے کہ آج بھی کچھ لوگ اُردو کو الیکشن اسٹنٹ بنانے کی بات سوچ رہے ہیں اگر ایسا ہوا تو اُردو دوستوں اور ہندی پریمیوں کا سیاسی ٹکراؤ یقینی ہے جس سے کہ اُردو کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس طور پر کچھ نشستیں آئندہ الیکشن میں حاصل ہو سکیں گی تو کیا اُردو کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

ذرا غور و فکر سے کام لیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمنانِ اُردو اس موقع سے فائدہ اُٹھائیں اور ہمیں بجائے کامیابی کے ناکامیابی کا مُنھ دیکھنا پڑے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہونا چاہیئے؟

انجمن ترقی اُردو اُترپردیش غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ صرف مزید مطالبات اور عرضداشتوں سے کام نہیں چلے گا۔ اس جمہوری دور میں ہمیں یہ آزادی ہے کہ ہم معاندانہ جذبات اور منافرت سے دور ہٹ کر مندرجۂ ذیل پروگرام کے مطابق منظم طور پر پُرامن دستوری تحریک چلانے کے لئے میدان عمل میں اتر آئیں۔ بقول علامہ اقبال،

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

پروگرام (۱) ہر ضلع اور قصبہ میں انجمن کی شاخ قائم کی جائے۔

(۲) پورے صوبے میں ممبر سازی کی جائے اور امسال کم از کم ایک لاکھ ممبر بنانے کی کوشش کی جائے۔

(۳) ممبر سازی کی مہم کے ساتھ ساتھ اسکول کھلنے سے پہلے اُردو زبان پڑھانے کے لئے پوری جد و جہد کے ساتھ داخلہ کرانے کی کوشش کی جائے۔

(۴) ایسے مقامات پر جہاں اسکولوں میں اُردو پڑھانے کا انتظام نہیں ہے یا جہاں ذمّہ داران تعلیم اس سلسلے میں گورنمنٹ کے سرکلر کی کسی وجہ سے پابندی نہیں کرتے۔ اراکین انجمن کو چاہیے کروہ تحریری طور پر ذمّہ داران ضلع پریسیڈنٹ میونسپل بورڈ اور سررشتہ تعلیم کو توجّہ دلائیں اور بار بار ان سے گورنمنٹ کے سرکلر کی پابندی کے لئے کہیں۔ اس تمام کارروائی کی اطلاع سکریٹری صوبائی انجمن کو بھی دیں تاکہ وہ حکومت کے ذمہ داروں کے سامنے معاملہ کو پیش کرسکیں۔

(۵) جن مقامات پر دفعہ ۴ کی کارروائی کرنے کے بعد بھی مقصد حاصل نہ ہو اس کی بھی مفصل اطلاع دی جائے تاکہ معاملے کو مجلس عاملہ کے سامنے پیش کرکے قانونی چارہ جوئی کے لئے غور کیا جاسکے۔

(۶) مقامی شاخیں ۱۵ر مئی ۱۹۶۴ء سے ۱۵ر جون ۱۹۶۴ء تک ایک ماہ کے اندر اپنی اپنی سہولتوں کے پیش نظر اُردو ہفتہ منائیں جس میں مندرجہ بالا معاملات کے حل کے لئے جد و جہد کریں اُردو کے لئے رائے عامہ ہموار کریں۔ جلسے کریں اور ادبی نشستوں کا سلسلہ جاری کریں۔

(۷) تمام ادبی انجمنوں اور ہمدردان اُردو سے درخواست کی جائے کہ وہ اُردو کے حقوق کی بقا و تحفظ اور اس کو علاقائی زبان منوانے میں انجمن ترقی اُردو اترپردیش کے ساتھ مکمل تعاون کریں تاکہ اس مشترک مقصد کے لئے پوری قوت کے ساتھ جد و جہد کی جاسکے۔

انجمن اوجین کی سرگرمیاں

انجمن ترقی اُردو شاخ اوجین کی زیر نگرانی جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات ادیب کامل۔ ادیب ماہر۔ ادیب۔ ابتدائی میں بیس طلبہ اور طالبات نے فارم بھرے تھے جس میں بارہ شریک امتحانات ہوئے اور سب کامیاب ہوئے۔ نومبر ۶۴ء کے امتحانات کیلئے طلبہ تیار کیے جارہے ہیں۔

انجمن کی کوشش سے حکومت مدھیہ پردیش نے اُوجین میں گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج میں اُردو بطور اختیاری مضمون پڑھانے کا حکم صادر کر دیا ہے۔ وکرم یونیورسٹی نے بھی نئے مضمون اُردو پڑھانے کی منظوری دے دی ہے۔ اگلے تعلیمی سال جولائی ۶۴ء سے طالبات بی اے سال اول میں اُردو بطور اختیاری مضمون لے سکیں گی۔ مادھو کالج اوجین میں ایم اے اُردو کلاس کے اجرا کیلئے کوشش جاری ہے۔

شری چنتامن گنیش اوجین شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں ایک قدیم مندر ہے، جہاں شری رام چندر جی نے زمانۂ بن باس میں اکیس دن عبادت کی تھی اور اُن کا دلی مقصد پورا ہوا تھا۔ یہاں ہر سال چیت میں چار بدھوار کو یاترا ہوتی ہے۔ پچاس ساٹھ ہزار زائرین آتے ہیں۔ منسٹر مالوہ جناب نندلال پوتدار صاحب کی کوشش سے یہاں ریلوے اسٹیشن قائم ہو گیا ہے۔ میلے کے ایام میں اسپیشل ٹرینیں چلتی ہیں۔ جناب پوتدار ہندو مسلم یکجہتی کے علم بردار ہیں۔ آخری یاترا کے موقع پر مشاعرہ اور کوی سمیلن ہوتا ہے۔ جہاں خصوصی قاضی شہر ہوتے ہیں صوبائی وزرا بھی شرکت کرتے ہیں۔ امسال بھی حسب اعلان سابق طرحی مشاعرہ اور کوی سمیلن ہوا۔ مشاعرہ کا انتظام سلطان احمد صدیقی ایم۔ اے ایل ایل۔ بی (علیگ) اور کوی سمیلن کا جناب بابولال کوٹھاری صاحب نے کیا۔ بیس شعراء اور پچیس کوی صاحبان نے شرکت کی۔

شعرا کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حضرت عادل مہدی خورشید بٹرنگری۔ اظہر۔ احسن عظیم۔ رحیم۔ ڈاکٹر مجنوں دولت آفریدی۔ مقصود۔ کمار۔ امرت۔ امراو۔ بالو۔ موہن حفیظ۔ قمر۔ طاہر۔ ظفر۔ راز۔ جنّات اوجینی۔

پہلے جناب پوتدار کی جانب سے دعوت عشائیہ (پریتی بھوج) ہوئی۔ آخر میں منتظمین نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ دو بجے رات کو مشاعرہ اور کوی سمیلن کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

سال گزشتہ کی روداد و انتخاب مشاعرہ کارساز ودگن راج درشن سب کو تقسیم کیا گیا۔

(سلطان احمد صدیقی۔ جنرل سکریٹری)

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

بقیہ: میری ہندی دشمنی

عکہ ہندی کی فلاح اور اُس کی ترقی کا راز اُردو اور ہندی کے مکمل انضمام میں مضمر ہے لیکن لسانی انضمام ایک فن ہے اور اگر ہم ہندی اور اُردو کے اس ملن کو واقعی کارآمد بنانا چاہتے ہیں تو ہم کو اس میں توازن برقرار رکھنا ہوگا۔ بشروعات اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ناگری رسم خط سیکھنا ہندی علاقے کے ہر طالب علم کے لئے لازمی کر دیا جائے۔ نصابی کتابوں میں ہندی کے ساتھ ساتھ پچاس فی صدی اردو نثر اور نظم نہایت صحت کے ساتھ ناگری رسم خط میں لکھی جائے۔

اور رفتہ رفتہ ہندی زبان میں تمام اُردو ادب کو ناگری رسم خط میں منتقل کر دیا جائے۔ فارسی رسم خط میں اُردو نظم و نثر کے مطالعہ کو اختیاری مضمون بنا دیا جائے۔

عکہ جس ہندی کو ہم ذریعہ تعلیم بنائیں وہ نہایت آسان اور ستھری ہو اور ناگری رسم خط میں ہو فنی اصطلاحات اگر سنسکرت کی ہوں تو کوئی حرج نہیں لیکن ان اصطلاحات کو عام فہم اور لچکدار بنانے کے لئے قواعد کی مبالغہ آمیز حد تک پابندی نہ کی جائے۔

عکہ کم از کم دس فی صدی طلبہ کی اختیاری مضمون کی حیثیت سے فارسی رسم خط میں اُردو کے مطالعے کے لئے ہمت افزائی کی جائے۔

عکہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کی بے تحاشا بھرمار کے عمل کو ختم کیا جائے اور اس کو ایک ایسی متوازن زبان بنایا جائے جس میں "ہندی" عنصر ہی زیادہ ہو۔

عکہ ہندی میں سے تقریباً دو ہزار ایسے عام فہم عربی فارسی الفاظ کو جو اب ہندی میں پوری طرح جذب ہو گئے ہیں خارج نہ کیا جائے اور ان کے اصل تلفظ کو برقرار رکھا جائے۔

عکہ میتھلی شرن گپت، نرالا وغیرہ کی ہندی کو پڑھ کر مجھے تسلی ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں ہندی کا دشمن ہوں بلکہ مجھے آنے والی اُن نسلوں کا خیال ہے جن سے ہمارے ملک کی اُمیدیں وابستہ ہیں ان کے لئے جو زبان بنائی جائے اُس میں لسانی بنیادوں کا لحاظ نہ ہو بلکہ ماہرین تعلیمات یہ کام انجام دیں جو ذوقِ سلیم اور ستھرے پن کی قدر و قیمت سے واقف ہوتے ہیں۔

عکہ میرا ایمان ہے کہ ہندی اُسی وقت پنپ سکتی ہے اگر اُردو کے اساتذہ اس میں لکھنے لگیں۔ کیونکہ یہی لوگ کھڑی بولی کے ماہر ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ہندی کے تمام مصنفین انگریزی سے اتنے ہی واقف ہوں جتنے کہ مہاتما گاندھی یا دوسرے انگریزی داں ہندوستانی ہیں۔ اُردو کا علم ہندی والوں کو کھڑی بولی کی کلید عطا کرے گا انگریزی کا علم اُن کو خیالات اور علوم و فنون کا بے پایاں ذخیرہ دے گا۔

عکہ میں اس بات کے حق میں ہوں کہ ناگری رسم خط کو پھیلایا جائے۔ میں اس بات کو بھی برا نہیں سمجھتا کہ ہندی میں ایک حد تک مناسب سنسکرت الفاظ ضم کئے جائیں۔ سمترا نندن پنت نے ایک بار مجھے بتایا کہ ان کی شاعری کسی زندہ زبان کی شاعری

نہیں معلوم ہوتی لیکن وہ مستقبل کی ہندی کے لئے کھاد کا کام کرے گی۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ زیادہ کھاد زمین کو زرخیز بنانے کے بجائے فصل کو جلا دیتی ہے۔

میں نے اپنا ما فی الضمیر بیان کر دیا ہے۔ آپ جی بھر کر مجھ کو ہندی دشمن کہہ لیں لیکن مجھے یقین ہے کہ حالات کا آخری فیصلہ میرے حق میں ہوگا اور ایک وقت آئے گا جب میں ہندی کا سب سے بڑا حامی سمجھا جاؤں گا۔ (ہندوستان ٹائمز)

نادر و نایاب مسودات

ڈاکٹر عبادت بریلوی جو ان دنوں لندن یونیورسٹی کے اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز اسکول میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں انھوں نے ڈیڑھ سال کے عرصے میں جو نادر و نایاب مسودے تلاش کئے ہیں اور ان پر تحقیقی نوٹ لکھے ہیں وہ یہ ہیں: (۱) نواب کریم خاں کی ڈائری جو اردو کی سب سے پہلی ڈائری ہے۔ نواب کریم خاں بہادر شاہ ظفر کے سفیر بن کر انگلینڈ گئے تھے۔ (۲) میر کاظم علی کی "شکنتلا"۔ (۳) ممتاز الملک نواب فیض علی خاں کی کتاب "ممتاز الامثال"۔ (۴) میرامن کی "گنج خوبی" اور (۵) جرأت کا کچھ کلام۔ (افکار کراچی)

لندن میں تہذیبی مرکز

لندن میں ہندوستان کا جو ثقافتی مرکز قائم کرنا تجویز ہوا ہے اس کی کچھ تفصیلات اب معلوم ہو گئی ہیں یہ تحریک لوکمانیہ تلک میموریل ٹرسٹ کی طرف سے کی گئی ہے۔ اس کام میں ٹیگور سوسائٹی اور گاندھی سوسائٹی بھی اس ادارے کی مدد کریں گی۔ اس پروگرام کے تحت ایک ایسی عمارت تعمیر کی جائے گی جو نہ صرف ہندوستانی ثقافت کا مرکز ہوگی بلکہ طلبہ اور اساتذہ کے لئے مطالعہ کے مرکز کا بھی کام دے گی۔ اس مرکز کے قیام پر تین لاکھ پچاس ہزار پونڈ خرچ ہوں گے۔ یہ رقم عطیات اور چندوں کی صورت میں جمع کی جائے گی۔

لوکمانیہ تلک کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر سنہ ۱۹۵۶ء میں تلک کی یادگار قائم کرنے کی اسکیم پیش کی گئی تھی چنانچہ ایک ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اس کے ٹرسٹیوں میں مہاراجہ میسور اور شری جے پرکاش نارائن اور دو برطانوی ممبران پارلیمنٹ مسٹر فینر بروکوے اور مسٹر جودتھ ہارٹ شامل ہیں۔ پہلا کام یہ تھا کہ ٹرسٹ وہ مکان حاصل کرے جس میں لوکمانیہ تلک اپنے سنہ ۱۹۱۹ء کے دورۂ انگلستان کے دوران ٹھہرے تھے۔ یہ مکان لندن میں تالبوت روڈ پر واقع ہے۔ اسے ہندوستانی طلبہ کے لئے ایک ہوسٹل میں تبدیل کیا گیا اور ارل ہونٹ بیٹن نے سنہ ۱۹۶۲ء میں اس کا افتتاح کیا۔ اب اس میں پانچ ہندوستانی طلبہ رہتے ہیں۔ اس کے باہر کی طرف ایک یادگاری پلیٹ لگی ہوئی ہے۔

اب جو ثقافتی مرکز قائم کیا جا رہا ہے، اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ مشرق اور مغرب میں ثقافتی تبادلے ہوں۔ اس مرکز کی طرف سے کچھ انعامات اور وظائف جاری کئے جائیں گے جو ہندوستانی اور غیر ہندوستانی طلبہ کو دئے جائیں گے اور ان کے ذریعہ ہندوستانی طلبہ کو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی اور غیر ہندوستانی طلبہ کو ہندوستان کے فلسفہ آرٹ ادب اور تاریخ کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع مہیا کیا جائے گا۔

اس ثقافتی مرکز کے قیام کے لئے کافی چندہ وصول ہو چکا ہے۔ (آفتاب سری نگر)

مجاز لائبریری احمد آباد

مجاز لائبریری کے سالانہ جلسے میں جو ۱۰ مئی سنہ ۱۹۶۴ء کو منعقد ہوا۔ جناب محمد ایوب صدر انجمن ترقی اردو (بہار) شاد عارفی، منیر الہ آبادی اور سید ظہیر الدین علوی کے انتقال پر تعزیتی قرار دادیں منظور کی گئیں۔

سالانہ رپورٹ اور گوشوارہ آمد و خرچ کی منظوری کے بعد مندرجہ ذیل عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر، منوّر علی۔ نائب صدر، رستم بھائی۔ سکریٹری نذار حسین اختر۔ نائب سکریٹری، نظام الدین۔ خازن، غنی بھائی۔ لائبریرین، دل شیر خاں۔

اراکین مجلس عاملہ:-

امتیاز جون پوری، عادل مچھلی شہری، قتیل گونڈوی، عبد الغنی اور منشی توفیق احمد۔ (سکریٹری)

گوا میں اردو

گوا میں ایک اردو ایسوسی ایشن قائم کی گئی ہے تاکہ اس علاقے میں اردو تعلیم کا سلسلہ جاری کیا جائے اردو کی تعمیر و ترقی کا پروگرام بھی اس میں شامل ہے۔ (شاعر بمبئی)

مراسلات

تذکرۂ خاکسار

میر تقی میرؔ نے نکات الشعرا میں محمد یار خاکسار کے حال میں لکھا ہے کہ :-

"علی الرغم ایں تذکرہ تذکرہ نوشتہ است
بنام 'معشوق چہل سالۂ خود'. و احوال خود را
اول از ہمہ نگاشتہ ، و خطاب خود سید الشعرا
پیش خود قرار دادہ" (نکات طبع دوم ص۱۷۱)

ڈاکٹر مولوی عبد الحق مرحوم و مغفور نے اس عبارت کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ خاکسار نے نکات کے جواب میں "معشوق چہل سالۂ خود" کے نام سے ایک تذکرہ لکھا تھا۔ ملاحظہ ہو مقدمۂ نکات الشعرا صفحہ الف و ب۔

میری دانست میں میر صاحب کا منشا یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "خاکسار نے اپنے کسی دوست کے نام سے نکات الشعرا کا جواب لکھا تھا" چونکہ میر صاحب خاکسار سے ناراض ہیں اس لئے جہاں اسکی اور برائیاں کی ہیں ، یہ بھی فرما دیا کہ فلاں تذکرہ حقیقت میں تو خاکسار نے خود لکھا ہے ، مگر اس اعتراض سے بچنے کے لئے کہ کوئی کہے گا اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں ، دوسرے کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ دوسرا شخص کون تھا ، اس کا ذکر خود میر صاحب نے بھی نہیں کیا ، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاکسار کا شاگرد یا دوست ہوگا۔ میر صاحب نے اس غریب کو معشوق بنا دیا۔ اور چونکہ وہ عمر دار ہوگا ، اس لئے یہ پھبتی بھی کس دی کہ "معشوق چہل سالہ" ہے۔

اگر خاکسار نے اس تذکرے کا نام رکھا ہوتا ، تو وہ "معشوق چہل سالہ" ہوتا اور بس۔ اس کے آخر میں "خود" کا دم چھلا کبھی نہ ہوتا ، الا یہ کہ نام تاریخ تالیف کا مظہر ہوتا۔ اور اگر خاکسار نے کوئی تذکرہ اپنے نام سے لکھا ہوتا۔ تو میر صاحب کے معاصر تذکرہ نویس جیسے قائمؔ و گردیزی و میر حسنؔ اس واقعے کا ضرور ذکر کرتے۔

مجھے امید ہے کہ ہماری زبان کے ذریعے ارباب تحقیق اس مسئلے پر روشنی ڈال کر مجھے ممنون فرمائیں گے۔ (امتیاز علی عرشی)

اُردو معمہ

(۱)

ہماری زبان میں آزمائشی معمہ اور اس پر موافق اور مخالف رائیں غور سے دیکھیں۔ ادبی معمے ذہنی مشق کے لئے چاہے جتنے بھی مفید اور عوام کی نظر میں دلچسپ ہوں مگر ہماری زبان جیسے خالص ادبی رسالے میں جس کا دامن ضروری مضامین کے لئے بھی ہمیشہ ناکافی رہتا ہے اس کا تھوڑا سا حصہ بھی معمہ کے لئے مخصوص کر دینا کسی عنوان بھی مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ اُردو کے کئی رسالوں میں ادبی معمے مسلسل نکل رہے ہیں اور معمہ سے دلچسپی رکھنے والے صاحبان ان رسالوں سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ (خاور جمیل پوری)

(۲)

اُردو معمہ ایک بہترین شغل ہے۔ معلومات بڑھتی ہے اور کتابیں مفت میں ملنے کا فائدہ بھی ہوتا ہے مگر ــــــــ ؟

اس سے انجمن کو یا "ہماری زبان" کو کیا فائدہ ہے؟ سوائے اس کے کہ ایک صفحہ ضائع ہو ؟ اگر مقصد انجمن سے لوگوں کو قریب کرنا ، اُردو کی ٹھوس خدمت کرنا ہے اور لوگوں میں اُردو لٹریچر کی تلاش و جستجو کا مادہ پیدا کرنا ہے تو یقیناً یہ معمہ جاری کرنا بہتر رہے گا۔ رہا شرائط کا معاملہ تو اس سلسلے میں آپ ہی مناسب شرائط سوچ سکتے ہیں۔ (جہانگیر جوہر)

ناول نگار کو انعام

فرانس اکاڈمی کی طرف سے مشہور سالانہ انعام "گرانڈ پرکس دیورو مان" جس کی قیمت ۵ ہزار فرانک ہے تاریخی ناول نگار ، ابرٹ مارگریٹ کو ایام انقلاب فرانس کے بارے میں لکھے گئے تین ناولوں پر ملا۔ کتابوں کے نام یہ ہیں :- "محبت اور وقت" "خوف کی قربانی" اور "فولادی آندھی" (ریڈرس ڈائجسٹ)

مجنوں گورکھپوری

تبصرہ

اُردوئے معلّٰی "میر سوز نمبر"

مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
ناشر: شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی
قیمت: سات روپے

تقریباً سو سال سے اُردو زبان و ادب کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ اس کے جتنے اکتسابات کلاسیکی قدر رکھتے ہیں ان کا خاصا حصہ یا تو اب تک اشاعت کی برکت سے محروم ہے، یا اگر کبھی چھپا بھی تو اب مفقود ہے۔ یہ ایک ایسی فلاکت ہے جو قومی اور ثقافتی زوال کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اور اس کے ذمہ دار متاخرین یعنی نوجوانوں کی نسل ہے جس کے سر سے یہ الزام کسی شرعی یا غیر شرعی حیلہ سے اٹھائے اُٹھ نہیں سکتا۔ نوجوان نسل حال میں اس قدر مبتلا اور اپنے ذاتی اور فوری معاملات و مسائل میں ایسی محو رہتی ہے کہ اس کو نہ تو ماضی کی زندہ قدروں کا کوئی احساس ہوتا ہے اور نہ صحیح اور صالح مستقبل کا کوئی واضح تصور اس کے ذہن میں پرورش پا سکتا ہے۔ اس نسل کو یہ نکتہ نہ معلوم ہے اور نہ معلوم اور محسوس کرنے کی پروا کہ جو فرد یا جماعت یا قوم کسی قابل فخر ماضی کی وارث نہیں ہے وہ کسی تاریخی مستقبل کی حقدار نہیں ہو سکتی۔ ہم اب تک اس راز سے ناواقف ہیں کہ اگر ہمارے پاس کوئی آبائی فکری سرمایہ اور عملی میراث نہیں ہے تو ہم کیا توشہ لے کر آگے چلیں گے اور کیسے ترقی کریں گے۔

سوچنے اور شرمانے کی بات ہے کہ مظہر جانِ جاناں، خواجہ احسن اللہ بیانؔ، مصحفیؔ، جعفر علی حسرتؔ جیسے اساتذہ شعر کے کلام ابھی تک ہم شائع نہیں کر سکے ہیں، سوائے ان انتخابات کے جو حسرت موہانی نے اپنی والہانہ دُھن میں "اُردوئے معلّٰی" میں شائع کر دیا ہے۔ قائمؔ کا کلام بھی اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ ابھی حال میں ان کی غزلوں کا دیوان ڈاکٹر خورشید الاسلام نے محنت اور کاوش کے ساتھ شائع کیا ہے جو ہمارے لئے ایک نئی یافت ہے۔ میر سوزؔ کا دیوان بھی، اس انتخاب کو چھوڑ کر جو حسرت موہانی نے اپنے اُردوئے معلّٰی میں شائع کر دیا ہے، اب تک ہمارے لئے ایسے دفینہ کا حکم رکھتا تھا جس کا مخطوطات کے سودائیوں کے سوا کسی کو پتہ نہیں تھا، حالانکہ وہ اُردو شاعری کے چار اوّلین ارکان میں شمار کئے جاتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے بالاتفاق ان کی شعری قابلیت کا مرتبہ تسلیم کیا ہے، اور ان کی غزل سرائی کی داد دی ہے۔ میر حسنؔ نے ان کو "شاعر شیریں بیان" اور "سخن سنج زباں داں" کہہ کر یاد کیا ہے اور ان کے کلام کا انتخاب ڈھائی صفحوں میں دیا ہے۔ "گلزار ابراہیم" میں ان کو "فن سخنوری میں استاد" اور "طرز ادا بندی کا بادشاہ" مانا گیا ہے۔ گارساں دتاسی نے ان کے اشعار کے طرز کو "مسرت بخش" بتایا ہے اور ان کو "ایک نئے مدرسۂ شعر کا سربراہ" قرار دیا ہے۔ محمد حسین آزاد ان کی "میٹھی زبان" کے معترف ہیں جو "غزل کی جان ہے۔"

سنا ہے پٹنہ یونی ورسٹی میں کسی نے میر سوزؔ کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے اور ڈاکٹری کی سند کے لئے بڑی محنت و کاوش کے ساتھ ان کا دیوان مرتب کر دیا ہے، لیکن ابھی وہ شائع ہو کر اہل ذوق کے ہاتھوں میں نہیں آیا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کا اُردو شعبہ ہماری مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اپنے تحقیقی مجلہ "اُردوئے معلّٰی" کی جلد چہارم شمارہ ۱ ۔ ۲ میر سوزؔ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ "اُردوئے معلّٰی" کا یہ "سوز نمبر" سوزؔ کی غزلیات، چند متفرق اشعار اور رباعیات، ایک مستزاد، چھ قطعات، ایک مخمس اور ایک مثنوی پر مشتمل ہے۔ تدوین میں سوزؔ کی کلیات کے صرف دو نسخوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے یعنی نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ اور نسخہ رضا لائبریری رام پور۔ فی الحال یہی دو نسخے قابل حصول تھے۔ آخر میں "تذکرہ مجمع الانتخاب" میں سوزؔ کے کلام کا جو انتخاب دیا ہوا ہے اس کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا لکھا ہوا ضخیم مقالہ ہے جس میں سوزؔ کے حالات زندگی، ان کے شاگردوں کی فہرست اور ان کی شاعری پر تنقیدی تبصرہ ہے۔ یہ مقالہ بڑی تحقیقی کاوش کے ساتھ لکھا گیا ہے جس سے میر سوزؔ کی شخصیت اور ان کی زندگی کے حالات کا ہم کو صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ سوزؔ کی شاعری پر جو تبصرہ ہے وہ البتہ ہم کو کچھ رسمی سا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے وہاں اب تک پہاڑ کھود کر

گھاس برآمد کرنے کو تحقیق کی معراج سمجھا جا رہا ہے، اور اہم اور غیر اہم واقعات کو عرق ریزی کے ساتھ گڈمڈ کر دینا علمی فضیلت اور تاریخی بصیرت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔ انہوں نے سوز کی زندگی کے سوانح کی ترتیب میں کافی تحقیقی بصیرت سے کام لیا ہے اور فضول باتوں کو شامل کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن سوز کی شاعری پر تنقید کا پورا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ خارجی حالات و اسباب کی تحقیق بڑی کارآمد ہوتی ہے، مگر اس کو مقصود بالذات سمجھنا فہم و فکر کی کوتاہی ہے۔ تاریخی واقعات و حوادث کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ ان سے ہم کو تاریخی درک حاصل ہو، اور ہم یہ سمجھ سکیں کہ کون سے واقعات و حوادث نے تاریخ کی رفتار کے لئے نئی سمت متعین کرنے میں عوامل کا کام کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس تاریخی حرکت و عمل کو روشن کر کے پیش کریں۔ اسی طرح کسی فنکار کے سوانح حیات پر جب ہم قلم اٹھائیں تو یہ دیکھیں کہ گرد و پیش کے موثرات اور اس کی اپنی زندگی کے واقعات نے اس کے شخصی کردار اور فنی مزاج کی تشکیل کس طرح اور کس حد تک کی ہے۔ سوز کا عہد سودا کے قصائد اور میر کی مثنویات کے باوجود، غزل کا عہد تھا، اور غزل اس عہد کا مزاج تھی۔ اس عہد نے چار اکابر کے علاوہ بھی کئی شعرا پیدا کئے جن کی آوازیں اردو غزل سرائی میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ ان میں سے ہر شاعر کی آواز اپنی ایک انفرادیت رکھتی تھی۔ غور کیجئے۔ سوز کے عہد میں سودا بھی تھے، میر بھی تھے اور درد بھی تھے، اور سب کے سب غزل کہہ رہے تھے، اور غزل کے باکمال شاعروں میں گنے جاتے تھے۔ لیکن ان میں سے ہر شاعر اپنا ایک جداگانہ مزاج اور مختلف انداز رکھتا تھا۔ اردو غزل کو یہی اس کی دین ہے۔ سوز بھی اپنا ایک شعری مزاج اور فنی کردار رکھتے تھے۔ ضرورت تھی کہ اس مزاج و کردار کا تجزیہ کر کے اردو غزل کے اس معصوم دور میں سوز کا مقام متعین کیا جاتا۔ ویسے سوز کے کلام کو اس طرح یکجا کر دینا خود اپنی جگہ بہت بڑا کام ہے۔ اگر اس میں کوئی مقدمہ یا دیباچہ نہ ہوتا تو بھی یہ ایک یادگار کوشش ہوتی۔ لیکن جب اتنا طویل مقدمہ لکھا گیا تھا تو اس میں سوز کی شاعری کی انفرادی خصوصیات کو بھی بھرپور نمایاں کرنا چاہئے تھا۔ بعض نازک مزاج ارباب تحقیق کو یہ اعتراض ہو سکتا ہے، اور شاید ہے بھی، کہ صرف دو نسخوں پر قناعت کر کے سوز کے کلام کی اشاعت کر دینا تحقیق و تدوین کے آداب کے خلاف ہے اور اس لئے غیر معتبر ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اسلاف کے علمی اور ادبی کارناموں کو جلد سے جلد شائع کر کے محفوظ کر دیا جائے، ورنہ وہ نوسن سٹی میں دفن ہو کر رہ جائیں گے۔ اگر کسی شاعر یا انشا پرداز کے رشحات فکر کا صرف ایک مسودہ بھی قابل حصول ہو تو اسی کو سامنے رکھ کر ان کو شائع کر دینا چاہئے۔ تحقیق ہوتی رہے گی، اور نئے نسخے برآمد ہوتے رہیں گے، اور غلطیوں کی تصحیح ہوتی رہے گی۔

آخر میں ہماری ایک تجویز ہے۔ اب اگر کبھی متقدمین یا متوسطین کا کلام شائع کیا جائے تو جو اشعار یا مصرعے نہ پڑھے جا سکیں یا مشتبہ ہوں یا جن کے بارے میں نسخوں کے درمیان اختلاف ہو ان کو متن میں نہ شامل کیا جائے بلکہ کتاب کے آخر میں توضیحی اشارات کے ساتھ اکٹھا کر دیا جائے تاکہ مطبوعہ کلام عام پڑھنے والے کو جگہ جگہ زخم خوردہ اور داغ دار نہ معلوم ہو۔

مقابلے کے امتحانوں میں ہندی

پبلک سروس کمیشن اور چند مرکزی وزارتوں کے مشورے پر مرکزی وزارت داخلہ اس بات پر غور کر رہی ہے کہ آئندہ سال سے مرکزی ملازمتوں کے لئے مقابلے کے امتحانوں میں ہندی کو جوابات دینے کا اختیاری یا متبادل ذریعہ بنا دیا جائے۔

یہ اقدام اس لئے کیا جا رہا ہے تاکہ ہندی اور انگریزی میں دیئے گئے جوابات کو جانچنے کے لئے یکساں معیار اور تکنیک قائم ہو جائے۔

۱۰ر اپریل سنہ۱۹۶۰ء کو جاری کئے گئے صدارتی حکم میں وزارت داخلہ کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مقابلے کے امتحانوں میں ہندی کو متبادل ذریعہ بنانے کے لئے پبلک سروس کمیشن سے مشورہ کر کے مناسب قدم اٹھائے۔ (نیشنل ہیرالڈ)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع کیا